فصل اوّل

عصری تہذیبی کش مکش اور خاندانی نظام پر اس کے اثرات

تہذیبوں کا تصادم؛ مغربی نقطۂ نظر

سیاسی مفکر سموئل بی ہنٹنگٹن (HUNTINGTON) جو اپنی کتاب 'تہذیبوں کا تصادم' (Clash of Civilizations) سے کافی مشہور ہوئے ۸۱ برس کی عمر میں ۲۴ دسمبر ۲۰۰۸ء کو Marth's Vineyard میں انتقال کر گئے۔ ان کی مذکورہ شہرۂ زمانہ کتاب میں دراصل سرد جنگ کے بعد کے دور کے لیے ایک نئے عالمی نظام کا فلسفہ پیش کیا گیا تھا۔ ہنٹنگٹن ۱۸ اپریل ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں ۵۸ سال پڑھانے کے بعد وہ ۲۰۰۷ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ تہذیبوں کے تصادم میں یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں اقوام کے ثقافتی اور مذہبی عقائد ان کے نظریاتی اختلافات تہذیبوں کے مابین تصادم کا اصل سبب ہوں گے۔

ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کو مغربی (یعنی امریکا و یورپ)، لاطینی امریکی، افریقی، اسلامی، قدامت پسند (روس سمیت سابق سوویت یونین ریاستیں) ہندو، جاپانی اور سنٹک (جس میں کوریا، سنگاپور، تائیوان اور ویتنام کی تہذیب شامل ہیں) خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا فلسفہ پہلی بار ۱۹۹۳ء میں ایک مقالے کی صورت میں جو فارن افئیرز کے جرنل میں شائع ہوا پیش کیا گیا اور بعد میں وسعت دے کر اسے ایک کتابی شکل دے دی گئی جو ۱۹۹۶ء میں The clash of civilizations and the remaking of world order کے عنوان سے شائع ہوئی۔

ہنٹنگٹن جب صرف ۱۸ سال کے تھے تو انہوں نے Yale سے گریجویشن کیا۔ انہوں نے شکاگو یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری لی اور ہارورڈ میں اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری مکمل کی۔ ۱۹۵۰ء میں ہنٹنگٹن ہارورڈ کے شعبۂ حکومت کے رکن ہوئے۔ ان کی اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

1- The Soldier and the State. The Theory and Politics of Civil-Military Relations (1957)
2- Politics Order in Changing Societies(1968)
3- The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century(1991),
4- The Clash ofCivilizations and the Remaking of World Order (1996)and
5- Who Are We? The Challenges to America's National Identity(2004)[۱]

ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilization) لکھنے سے پہلے اپنے ایک ہم وطن دانشور ہنری کسنجر کا ایک قول پڑھا تھا جو اس نے سرد جنگ کے زمانے میں لکھا تھا کہ 'اکیسویں صدی میں بین الاقوامی نظام' چھ بڑی طاقتوں پر استوار ہوگا یعنی امریکہ، یورپ، چین، روس اور ممکن ہے کہ انڈیا۔ مصنف نے جب قلم اٹھایا تو سرد جنگ ختم

۱۔ سید شاہد ہاشمی، معارف فیچر سروس، جلد دوم، شمارہ ۔۲۰، ۱۶ جنوری ۲۰۰۹ء

ہوچکی تھی اور اکھاڑے میں صرف امریکہ دندنا تا رہ گیا تھا۔ اس لیے مصنف نے طاقتوں کا لفظ 'مصلحتاً' کاٹ کر لفظ تہذیبیں رکھ دیا اور مذکورہ چھ تہذیبوں کو پٹی پٹائی ثابت کرنے کے لیے اس نے کہا:

''ان چھپن ریاستوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو بے شک الگ الگ تاریخ ،جغرافیہ ،زبان ، ثقافت اور تمدنی روایات رکھتی ہیں ،لیکن اسلام کی رسی میں بندھ کر بلائے جان بن سکتی ہیں۔ پس چونکہ مسلمان دنیا کو 'دارالامن' اور 'دارالحرب' میں بانٹتے ہیں۔ اس لیے امریکی دانشوروں کو بھی دنیا کو 'امن کے علاقوں اور حرب وضرب کے علاقوں' میں تقسیم کرلینا چاہیے۔[۲]

مصنف بڑا دانا اور زیرک ہے۔ گذشتہ تین ہزار سال کے دوران میں ابھرنے اور ڈوبنے والی تہذیبوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور ان کی باہمی کشمکش کی داستان پر اس کی نظر بہت گہری ہے ، اور اس کے علاوہ وہ دور اندیش بھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا خالی وقت نہیں آیا جب دو تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم نہ رہی ہوں اور طاقتور سے طاقتور تہذیب خواہ کتنی بھی بلندی پر گئی ہو ، ایک دن ضرور گرے گی ،لیکن اس تہذیب کو موجودہ عروج مسلسل ساڑھے پانچ صدیوں کی سخت کاوشوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ اس لیے اسے زوال آتے آتے بھی پوری ایک صدی لگ جائے گی۔ چنانچہ اکیسویں صدی پر تو لازماً مغرب کی برتری قائم رہے گی اور اگر وہ بائیسویں صدی میں خود کو برقرار رکھنا چاہیں تو اس کی بنیادی ذمہ داری مغربی تہذیب کے موجودہ اجارہ دار امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔

فوکویاما کے اختتام تاریخ ، کے نظریہ کے بعد اب دنیا ھنٹنگٹن کی تہذیبوں کے تصادم کی پیش گوئی پر بحث ومباحثہ میں مصروف ہے۔ یہ بحث' بالعموم تاریخ کی حرکیات کے بارے میں مغرب کے پیش کردہ تصورات کی حدود کے اندر ہورہی ہے۔

ھنٹنگٹن کی یہ بات تو درست ہے کہ عالمی سیاست کے رجحان میں اضافہ اور قومی ریاستوں کے کردار میں کمی ہورہی ہے۔لیکن جب وہ ریاستوں کے درمیان کشمکش کے بجائے عالمی تہذیبوں کے درمیان تصادم کی پیش گوئی کرتا ہے تو دراصل وہ تنگ نظری کا شکار ہوجاتا ہے۔اس کے نزدیک انسان کے تہذیبی رشتوں کو اس کے سیاسی نظریات اور معاشی مفادات پر فوقیت حاصل ہے۔

مغرب کے علمی حلقوں میں پیش کیے جانے والے ان خیالات کا جوان کی صدیوں کی محدود سوچ کے آئینہ دار ہیں' ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مغرب کے علمی رویوں پر' اس کی تہذیب کے متبادل فکر وعمل کے بارے میں سخت تعصب کی چھاپ ہے۔اس کی جڑیں مغرب کے تاریخی تجربے میں ہیں۔رومن ایمپائر کے قبول عیسائیت سے چرچ کو جو بالاتر کردار ملا' اس نے چرچ کے ادارے کو دنیا پرستی اور استحصال کی علامت بنادیا۔بالآخر چرچ کے کردار کو محدود کردیا گیا۔اس تاریخی عمل نے مغرب کے اہل علم کو مذہب کے بارے میں تعصب میں مبتلا کردیا ہے۔اب وہ ہر ایسے نظام کو مسترد کرتے ہیں جس کا محور مذہب ہو۔وہ انسان اور کائنات کے کسی ایسے تصور کو قبول نہیں کرتے جس کا پس منظر مذہبی ہو۔

۲۔ سید قاسم محمود، تہذیبی کشمکش اور مسلم نفسیات ، فار ایسٹرن اکنامک ریویو، ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ء

انہیں بدھ، کنفیوشس یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی افادیت نظر نہیں آتی وہ مذہب کو ہم آہنگی اور توافق کے بجائے تنازع اور تفریق کا سبب گردانتے ہیں۔ جدید مغرب ان تمام ثقافتی روایات کو اجنبی سمجھتا ہے جو مذہب کو مسترد کرنے میں اس کو شریک نہیں ہیں۔

۲۔ ڈارون اور اس کے شاگردوں کے وقت سے مغرب میں جو خیالات رائج ہیں وہ انسان کو ایک نوع قرار دیتے ہیں جو تنازع للبقا کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ اس کا اثر ہے کہ مغرب کا ذہن مسلسل تنازع اور کشمکش کو انسانی زندگی کا لازمی قانون سمجھتا ہے۔ پھر فرائڈ نے نفسیات کے ایسے نظریے پیش کیے جن سے انسان، اسفل جذبات کا اسیر، ایک خودغرض جانور ثابت ہوتا ہے۔ غرض مغرب کا ٹائن بی کا ''چیلنج اور جواب'' کا نظریہ بھی اسی کا اثر کہا جاسکتا ہے۔ مغرب کی نظر میں نام نہاد بقائے اصلح ہی اصل الاصول ہے۔ کوئی اخلاقی قدر اس طے شدہ عمل میں مداخلت نہیں کرسکتی۔ اس لیے ھنٹنگٹن تہذیبوں کے لیے دوہرے معیارات کا جواز تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کا اختیار قدرتی طور پر غالب تہذیب کو حاصل رہے گا۔ کمزور کا کوئی حق نہ ہوگا۔ عدل، مساوات، سب بے معنی الفاظ ہوجائیں گے۔ اگر انسانی معاملات کو عدل و انصاف سے چلایا جانا ہے تو انہیں افراد کی پسند و ناپسند سے بالا کسی اعلیٰ تر اخلاقی نظام کی مستقل اقدار پر مبنی ہونا چاہیے۔ اگر یہ منطق تسلیم کی جائے تو ڈارون کے ورلڈ ویو کی عمارت گر جاتی ہے۔

۳۔ مغرب کے اہل علم و دانش بالعموم مختلف تہذیبوں کے ایک دوسرے کو مالا مال کرنے کے عمل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہنٹنگٹن کے نتائج بھی اس کی غمازی کرتے ہیں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی تہذیب یکا یک خلا سے آکر واقع نہیں ہوئی ہے۔ ہر تہذیب ماضی کے ورثہ سے اور معاصر تہذیبوں سے اخذ کرتی ہے۔ اس لیے تہذیب انسانی کا طرہ امتیاز باہمی لین دین ہے نہ کہ تنازع و تصادم، جیسا کہ ھنٹنگٹن نے پیش کیا ہے۔

۴۔ گذشتہ عشروں کی سائنس کی ترقی نے انسانی مقاصد کے ناقابل تقسیم اور مشترک ہونے کی سمت میں شواہد پیش کیے ہیں۔ جس کسی کو انسانیت کی بقاء عزیز ہے اسے اختلاف و افتراق کے بجائے اتحاد و اشتراک کے لیے اقدامات کرنا چاہئیں۔ لیکن مغرب میں سارا زور انسانیت کے مختلف عناصر کے درمیان کشمکش اور تصادم بڑھانے پر ہے۔ یہ وقت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

۵۔ مغرب قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے۔ ھنٹنگٹن کے نظریے میں بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی پہلو کو سرے سے کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ مغرب تاریخ انسانی میں انسان کے کردار کو اہمیت نہیں دیتا۔ انسانیت کے خلاف جو جرائم کیے جارہے ہیں، جو جنگیں لڑوائی جارہی ہیں، سی آئی اے، کے جی بی، موساد اور را بھی سازشوں میں مصروف ہیں۔ ان سب کو نظر انداز کرکے، بعض قوموں کی ناکامی کو ان کے نسلی طور پر نااہل اور بعض کی کامیابی کو ان کی نسلی برتری کا سبب قرار دیتا ہے۔ اسی طرح فاتح اور مفتوح دونوں تاریخ کی تخلیق نظر آتے ہیں۔ اس طرح، تاریخ کی حیثیت ایک اندھے اور بے رحم قانون کے عمل کی ہوجاتی ہے۔ انسان ذمہ دار نہیں رہتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ تاریخ انسانی میں اپنے مثبت کردار کو تسلیم کروانے سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

۶۔ مغرب کے علم میں ایک اہم خامی اور بھی ہے جس کا نوٹس لینا چاہیے۔ یہ جو ہے، اس سے جو ہونا چاہیے، کا نتیجہ

نکالتا ہے۔لیکن یہ، ہے، تحقیق کار کے اپنے رجحان اور تعصب سے متاثر ہوتا ہے۔معروضیت کے نام نہاد دعوؤں کے باوجود تحقیق کار انہی نتائج کو پیش کرتا ہے جو اس کے نظریے کے مطابق ہوتے ہیں اور ازحقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے نظریے کی تائید نہیں کرتے۔اسی لیے حقیقت مسخ ہو کر سامنے آتی ہے۔

ھنٹنگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں یہ چند خیالات ہیں۔ضرورت ہے کہ اس کا مفصل ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔اس سے مغرب کے اہل علم کے بعض بنیادی طور پر غلط تصورات سامنے آتے ہیں۔[۳]

ڈارون کا تنازع للبقا اور بقائے اصلح کا نظریہ

ڈارون کا شمار دنیا کے ان جدید سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔جنہوں نے حیاتیاتی علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ان کے خیال میں انسان کی موجودہ شکل ارتقا یافتہ ہے اور یہ شکل اس کی بنیادی شکل وصورت سے بالکل مختلف ہے۔اس نے انسان کو ایک ایسا جانور قرار دیا ہے۔جو بولنے والا سوچنے والا اور سمجھنے والا ہے۔دوسرے کئی ایک سائنس دانوں کی طرح اس کے خیال میں بھی انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔جو ترقی کی منازل طے کرتا ہوا موجودہ شکل میں جلوہ گر ہے۔

ڈارون اگرچہ ایک طبیب کا بیٹا تھا،لیکن ذاتی طور پر اس کو ادویات سازی۔اور مختلف بیماریوں کی تشخیص کے سلسلے میں اکثر بیمار آدمیوں سے دوچار رہنے سے نفرت ہوگئی تھی۔اس نے محسوس کیا کہ یہ تمام تر ادویات ایک ایسے جانور کے لیے تیار کی جاتی ہیں جو محض اس لیے اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ بول سکتا ہے۔اور اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا کر سکتا ہے۔اس کو قلق تھا کہ دوسرے جانور ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔حالانکہ ان کے بھی سر ہیں،آنکھیں ہیں، دماغ ہے ہاتھ پاؤں اور جسم ہیں۔ان میں بھی خواہشات ہیں۔چنانچہ اس نے اپنے اس خیال کی تسکین کے لیے مختلف حیوانات کی زندگیوں کے بارے میں مطالعہ شروع کر دیا۔اور اس مطالعے کے لیے اس نے سمندر پار بہت سے ممالک کا دورہ بھی کیا۔

اس پر ڈارون نے سوچا،کہ طرز افزایش نسل اور طریق افزایش نسل انسانوں اور حیوانوں کے تو ایک جیسے ہی ہیں۔بلکہ جانوروں میں افزایش انسانوں کی نسبت زیادہ بہتات سے ہوتی ہے۔تو پھر جانور کیوں کم رہتے ہیں۔اور انسان کیوں اتنی زیادہ تعداد میں بڑھتے جا رہے ہیں اس گہری سوچ کے بعد اس نے زندگی کے حقائق اور زندگی کی بقا کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔اور ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام جانوروں کی اقسام کی بنیاد یعنی Origin of Species رکھا۔اس کتاب میں اس نے مختلف جانوروں کی اقسام کی اور ان کی نسلوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔جانوروں کے ذکر میں اس نے ایک باب انسان کے لیے بھی وقف کر دیا۔جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی۔کہ انسان اصل میں بندر تھا۔اس کتاب کی اشاعت سے عالمی سطح کا ایک تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔کیونکہ یہ ایک کھلا چیلنج تھا۔پورے معاشرے کو اور مذہب کو۔کیونکہ دنیا کا کوئی بھی مذہب اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ انسان کی موجودہ شکل ارتقائی نوعیت کی ہے،اصل نہیں ہے۔

ڈارون کا یہ نظریہ قطعی طور پر خیالی اختراع ہے۔جس کا نہ تو وہ کوئی مادی ثبوت پیش کر سکا ہے۔نہ منطقی دنیا کی کوئی تہذیب۔کوئی مذہب اور کوئی دین اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ جس اشرف المخلوقات کو ذات باری تعالیٰ نے خود تشکیل

۳۔ مسلم سجاد،تہذیبوں کا تصادم ایک جائزہ،ماہنامہ ترجمان القرآن،ستمبر ۱۹۹۵ء

دلایا۔ وہ جسمانی اعتبار سے اس قدر عجیب وغریب ہو۔جس کا اندازہ ایک بندر یا بن مانس کو دیکھ کر ہوسکتا ہے۔علاوہ ازیں دنیا کی کوئی سائنس اس دعوے کو آج تک ثابت نہیں کرسکی ہے۔خود مغرب نے زبردست نوعیت کے محقق کیمیادان طبیب اور سرجن پیدا کیے ہیں۔ جوانسانی غدودوں اور دوسرے جانوروں کی غدودوں سے مکمل طور پر آشنا ہیں۔ یہ لوگ بھی انسان کو بندر ہونا ثابت نہیں کرسکے۔تو ڈارون نے محض خیال آرائی سے طب وحیاتیات کی دنیا میں فساد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نظریہ ارتقاء یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

ڈارون کا نظریہ جس طرح انیسویں صدی کے وسط میں صرف ایک نظریہ تھا' اس طرح آج اس بیسویں صدی کے وسط میں بھی صرف ایک نظریہ ہی ہے۔واقعہ اور حقیقت (Fact) ابھی تک ثابت نہیں ہوسکا ہے۔نظریہ اور واقعہ کا فرق کسی تعلیم یافتہ آدمی سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا اور یہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے لیے اپنے ایمان پر نظرثانی کرنے کا سوال اگر کہیں پیدا ہوسکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ وہ چیز جس پر وہ ایمان رکھتا ہے کسی ایسی چیز سے ٹکرا جائے جو ثابت شدہ واقع ہو ورنہ جو ایمان قیاسات ونظریات کی ٹکر بھی نہ سہہ سکے' وہ ایمان تو نہیں محض ایک حسن ظن ہے جو زری افواہوں پر بدگمانی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ڈارونی نظریہ ارتقاء کی اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر اب ذرا اس کے علمی واستدلالی مرتبے کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے۔علم الحیات (Biology) کے جس مشکل ترین مسئلہ میں سائنس کے علماء الجھ رہے ہیں' وہ دراصل یہ سوال ہے کہ زندگی کا مبدا کیا ہے۔قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کا مبدا خدا کا حکم (امرِ رب) ہے۔وہ صرف خدا کا حکم ہی ہے جو بے جان مادے میں آثارِ حیات پیدا کردیتا ہے۔لیکن مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کے دور سے موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشوونما پاتا رہا ہے' ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اس کارخانہ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super Natur) کی کارفرمائی وکاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے جس طرح بھی بن پڑے' پہلو بچائیں۔ان کی خواہش یہ رہی ہے کہ اس کارگاہ فطرت کے اندر کے ہی انہیں اس کی کارفرماطاقت کا بھی کہیں سراغ مل جائے۔اسی بنیادی غلطی نے ان کے لیے وہ مشکل سوالات پیدا کیے جنہیں حل کرنے کے لیے ان کو قیاس آرائیوں سے کام لینا پڑا۔قیاس آرائیوں ہی سے انہوں نے حیات کی ابتدا کا عقیدہ سلجھانے کی کوشش کی اور پھر قیاس آرائی ہی سے انہوں نے اس سوال کو بھی سمجھنا چاہا کہ حیات میں اس تنوع کی وجہ کیا ہے اور مختلف انواع کے درمیان تفاضل کا سبب کیا ہے۔ڈارون ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے اس طرز پر ان سوالات کی تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نے خود کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ حقیقت کو پا گیا ہے۔اس کے نظریہ کے قائلین میں سے جو لوگ فی الواقع سائنٹسٹ ہیں' وہ بھی اپنے قیاس کو حقیقت اور واقعہ نہیں قرار دیتے۔مگر جن لوگوں کو سائنس کی اڑتی ہوئی ہوا لگ گئی ہے وہ اس زورشور سے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ گویا حقیقت بے نقاب ہوکر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

ڈارون نے جب تحقیق وتجسس کا آغاز کیا' اس وقت اگر وہ قرآن کے دیے ہوئے نقطہ آغاز (Starting point) سے چلتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاضل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ بھنگے (Unicellular Molecule) سے لے کر انسان تک میں نظر آرہا ہے یہ ایک حکیم کے منصوبے (Design) کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لیے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد انہیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے

ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے خاکے میں باقی نہیں رہی ہے انہیں مٹاتا بھی رہا ہے۔لیکن چوں کہ یہ لوگ منصوبہ ساز (Plan designer) ماننے سے جی چراتے ہیں اور اس کی کارگاہ میں اس کی کارفرمائی کے نشانات دیکھنا نہیں چاہتے۔اس لیے جو مشہودات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کی توجیہ یہ کسی ایسے طریقے سے کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ کارخانہ خود بخود چلتا اور ترقی کرتا ہوا سمجھا جاسکے۔یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے تنوع اور تفاضل کی توجیہ ارتقاء کے اس نظریہ سے کی جو اس کے نام سے مشہور ہے اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے جو اس وقت تک اپنے الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا' لپک کر لکڑی کے پاؤں ہاتھوں ہاتھ لیے اور نہ صرف اپنے سائنس کے تمام شعبوں میں' بلکہ اپنے فلسفہ و اخلاق اور اپنے علوم عمران تک میں ان کو نیچے سے نصب کرلیا۔حالانکہ علمی اور عقلی حیثیت سے اس توجیہ میں اتنے جھول تھے اور ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی صاف دماغ کا آدمی اس کو منظر (phenomena) کی ممکن توجیہات میں سے ایک قابل لحاظ توجیہ قرار دے سکتا ہے۔[۴]

ڈارون کے نظریاتی پیروکاروں نے انسانوں کو بھی حیوانی معاشرے قیاس کرلیا ہے اور غزہ اور فلسطین، عراق اور افغانستان میں اور مغرب میں خود اپنے ہاتھوں سکولوں اور کالجوں میں یہ حیوانی منظر نامہ نظر آ رہا ہے۔ اخلاقی حس کو جدید معاشرے نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ غلط اور صحیح، حق و ناحق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہا۔ اسی اخلاقی زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے علم طبیعات کی ایک ماہر خاتون مسز ہڈسن کہتی ہیں :

> ''ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آ گیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہوجائے ؟ ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ نظم وضبط کی پابندیاں اختیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اس کی بقا کی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کی جائے کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں اس لیے ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہورہی ہیں۔ اس معاملے میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مرد وعورت کا خود اپنے ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا ، انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا تشویشناک ہے۔''[۵]

نظریہ ارتقا جس کا دعویٰ ہے کہ ہر شے اتفاقی حادثے کے نتیجے میں وجود میں آ گئی ہے،فطرت میں موجود فن کاری، نیرنگی اور تناسب کی وجہ سے،ایک بند گلی میں پہنچ گیا ہے۔چارلس ڈارون جو اس نظریے کا بانی ہے اور جس نے اسے موجودہ حالت تک پہنچایا ہے، جاندار اشیا کی ساخت کی بدولت اسے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

ڈارون نے کہا کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ جان دار مخلوقات کے رنگ مخصوص معنی کے حامل کیوں ہیں؟ میری مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھار مکوڑے ایسے خوب صورت اور فن کارانہ رنگوں کے کیوں ہوتے ہیں؟ یہ دیکھ کر کہ ان میں سے بہت سے رنگ

۴۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن ،محرم ،صفر۱۳۶۳ھ مطابق جنوری ، فروری ۱۹۴۴ء

۵۔ سید جلال الدین عمری ،عورت اسلامی معاشرے میں،ص ۲۲۹،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز انڈیا

خطرے سے بچاؤ کے لیے ہوتے ہیں، میں ان شوخ رنگوں کو دوسری صورتوں میں محض طبعی حالات کی طرف منسوب نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ نر تتلیاں اور مکوڑے اس قدر خوب صورت کیوں ہوتے ہیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں مگر مجھے اپنی رائے پر قائم رہنا چاہیے۔

ایک بار پھر چارلس ڈارون اپنے ہی نظریے میں موجود تضاد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں روشن رنگ نر مچھلیوں اور مادہ تتلیوں کی قدر کرتا ہوں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک جنس کی خوب صورتی کی قیمت دوسری کو نہیں دینا پڑتی۔ اس معاملے میں مجھے نہیں لگتا کہ فطری انتخاب کے عمل سے یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ ایک جنس کی خوب صورتی دوسری کی وجہ سے متاثر ہوئی''۔[۶]

اس حقیقت کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ایسے نفیس نظام اور فن کاری سمیت یہ کائنات کسی بھی طور اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتی۔ پروفیسر کیمل یلدرم (Cemal Yildirm) اگرچہ وہ خود ایک ارتقاپسند ہے، اپنی کتاب Theory of Evolution and Bigotry میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے: ''اس بات پر قائل ہوجانا بے حد بعید از مکان ہے کہ جان دار اشیا کی اس تنظیم کو جو کسی خاص مقصد کی حامل نظر آتی ہے، کسی اتفاق یا حادثے سے منسوب کردیا جائے''۔[۷]

اللہ نے کائنات میں ہر شے کو ایک بڑی تنظیم میں پرویا ہے۔ اللہ کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے:

﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ O اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾[۸]

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ (اس حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں، ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔

ان مغربی مفکرین کی آراء جاننے کے بعد نہ صرف مغربی معاشرہ ہی اخلاقی تباہی و بربادی کا شکار ہے بلکہ مسلم امہ بھی اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ مسلمان ملت اسلامیہ تو وہ خوش نصیب قوم ہے جس کو اس کائنات کے خالق نے خیر

۶۔ ہارون یحییٰ، یہ رنگ بھری دنیا، (مترجم) گلناز کوثر، ادارہ اسلامیات انارکلی، ص ۵۸، ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۸ء

۷۔ Cemal Yildirm, Theory of Evolution and Bigotry

۸۔ البقرۃ ۲:۱۶۳-۱۶۴

اُمت کے لقب سے نوازا ہے۔

آج ہماری بدنصیبی ہے کہ خیر اُمت ایک غلام امت میں تبدیل ہوچکی ہے ہم اپنی فکر، سوچ، تہذیب، اخلاق سب دائروں میں غلامی کی پستیوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔مغربی معاشرت کی مادہ پرستی اور خودغرضی نے انسانی رتبے کو حیوانیت سے تعبیر کردیا ہے جیسا کہ ڈارون نے اپنے فلسفے میں انسان کو شخصیت اور وجود سے ہی محروم انسان قرار دیا تھا۔

ڈارون کے نزدیک :انسانی زندگی کیمیائی طبعی عوامل کا تعامل اور مالیکیولوں کا کھیل ہے۔

یعنی طبعی عوامل میں زندگی شعور اور روح کا کوئی تصور نہیں ہے لہٰذا نہ انسان کی کوئی اساس ہے نہ ہی انسانیت کی کوئی اساس۔ڈارون کے تصورات نے انسان کے مسائل میں اضافہ کیا ہے انسان کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد نہیں مل رہی۔

ڈارون اور دی لیمارک کے خیال میں انسان کی فطرت ''حیوانی'' ہے۔یعنی انسان کو بھی حیوانی معاشرے قیاس کرلیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو آج کا انسان بھی ڈارون کا انسان ہے۔ایک ایسا انسان جو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔[۹]

مادہ پرستی ،خودغرضی اور تسلط اور غلبے کی خواہش نے ایسا حیوانی معاشرہ جنم دیا ہے کہ جس میں انسان تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے اپنی قدر و قیمت کھوتا جا رہا ہے۔[۱۰]

تہذیبوں کا تصادم؛ اسلامی نقطۂ نظر

اسلامی نظام تہذیب و تربیت پر مبنی ہے۔ اسلام ایک ایسا راستہ وضع کرتا ہے جو حقیقت میں ''صراط مستقیم'' ہے۔ اسلام نے تہذیب و تربیت کا جو نظام وضع کیا ہے اسی میں انسان کی فلاح ہے۔

اسلام کے اصولوں میں سب سے پہلے اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہ دنیا و آخرت کا حاکم ہے اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لیے رسول بھیجے ہیں اور انہی کے ذریعہ کتاب و شریعت کا علم دیا ہے۔ اس کتاب و شریعت کے ذریعہ اسلام ہمیں اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔اچھائی اور برائی میں تمیز سکھاتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ O تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ O وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ O يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾[۱۱]

۹۔ ہارون یحییٰ، یہ رنگ بھری دنیا، (مترجم) گلناز کوثر، ادارہ اسلامیات انارکلی ،صفحہ ۵۸، ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۸ء

۱۰۔ علی عزت بیگووچ (اسلام و مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش) ادارہ معارف اسلامی ص ۴۵، ۴۶

۱۱۔ ابراہیم ۱۴:۲۴-۲۷

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال دی ہے؟ وہ گویا ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑ خوب جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک بلند ہیں وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمہ وقت پھل لاتا رہتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تا کہ وہ سبق حاصل کریں اور کلمہ خبیثہ (اعتقاد باطل) کی مثال ایک ایسے درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھیڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی جماؤ اور مضبوطی ہی نہیں رکھتا۔ اللہ ایمان لانے والوں کو ایک قوت ثابت (پکے اعتقاد) کے ساتھ دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں استحکام بخشتا ہے اور ظالموں کو یوں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اسلام کی پہلی اور لازمی شرط کلمہ طیبہ ہے یعنی **لاالٰہ الااللہ** ۔مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی میں اسے الوہیت کے لفظ سے ذکر کیا ہے۔۱۲

یہ کلمہ اس ذات کے لیے 'الوہیت' ثابت کرتا ہے جس کا نام 'اللہ' ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اس پر ایمان لاؤ۔ اس کے آگے جھکو، اس کی تعظیم کرو، اسی سے محبت کرو، اس سے خوف کھاؤ۔ اسی سے امید رکھو، جو مانگو اسی سے مانگو۔ ہر حال میں توکل اسی پر کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے پاس واپس جانا ہے اسی کو حساب دینا ہے اور تمہارا اچھا یا برا انجام اس کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

اسلامی افکار و خیالات رکھنے والے لوگ اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لانے والے لوگ ہیں اور انہی احکامات کے مطابق تہذیب و اخلاقی اقدار و معاشرت کو وجود میں لانا چاہتے ہیں لیکن جو لوگ محض روشن خیالی کے نام پر اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی پیروی سے انکار کرتے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے تہذیبی و اخلاقی اقدار کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے ارشاد ہے:

﴿وَّ غَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا﴾ ۱۳

''ان کو حیات دنیا نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے''

اور ایسے لوگ آج کے معاشرے میں موجود ہیں جنہوں نے دنیا کو اور لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے اور ہماری تہذیبی و اخلاقی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ تہذیبی و اخلاقی بنیادیں ہل گئیں تو ہم نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے۔ ہماری آئندہ نسلیں بھی خطرے کا شکار ہیں۔ ہماری آئندہ نسلوں میں بھی ایک ایسی تہذیب کو راسخ کیا جا رہا ہے جس کی کھوکھلی بنیادیں ہیں جو کہ اس درخت کی مانند ہے جس کا ذکر اس سے پہلے قرآن کی آیت میں کیا گیا ہے۔ ایک ایسا درخت جو کہ کوئی جماؤ اور مضبوطی نہیں رکھتا ہے۔ آج کی معاشرتی تہذیب و اخلاق کی بنیادیں حقیقت میں ایسی کھوکھلی ہیں۔ ہمارا معاشرہ بھی بہت حد تک مغربی تہذیب و اقدار کو اپنا رہا ہے، جس کے نتیجہ میں اسلامی قدریں بھی کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں جبکہ خود مغربی مفکرین اپنی ان اقدار اور موجودہ تہذیب سے خوفزدہ ہیں۔ ڈاکٹر ایلیکس کارل اپنی کتاب Man the Unknown میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''آدمی کو خود اپنی توجہ اپنے اوپر اور اپنی ذات اور ذہنی و اخلاقی اہلیت پر کرنی چاہیے۔ اپنے تمدن میں

۱۲۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۳۵ ۱۳۔ الاعراف ۷:۵۱

لذت تعیش، جمالیات، وسعت و پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل ہے جبکہ اسی تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رخ پر لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایک ایسے طریق زندگی کے بنانے پر دیدہ ریزی کی جائے جو اخلاقی زوال اور عظیم نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمے کا موجب ہو رہا ہے۔''[۱۴]

انسان کی حیثیت

اس کے برعکس تہذیب اسلامی میں انسان اشرف المخلوقات قرار پاتا ہے اور اس کے لیے اس پوری کائنات کو مسخر کرکے اس کی باگیں انسان کے ہاتھوں میں تھمادی گئی ہیں۔ مولانا مودودیؒ اپنے مشہور خطاب بعنوان ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' میں فرماتے ہیں:

''انسان میں دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر، جن پر دوسری تمام طبعی و حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی، یا باالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔ یہ اخلاقی وجود طبیعات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے، یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، اور اس پر فرمانروائی بھی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔ انسان کے عروج و زوال کا دارومدار اخلاق پر ہے۔ یعنی یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا دارومدار مادی و اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہی ہوسکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت ہی ہے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں۔

لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی۔ مگر وہ اصل چیز جو کہ انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہے جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔

ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔''[۱۵]

---

۱۴ Alexisc Carrel (Man the Unknown) P-21

۱۵۔ روداد جماعت اسلامی (حصہ سوم) اسلامک پبلی کیشنز، ص ۱۸۳، ۱۸۴

یعنی مولانا صاحب کا یہ فلسفہ ڈارون کے فلسفے کی کسی حد تک تردید بھی کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ انسان حیوانیت پسند شخصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ انسان کی اصل پہچان اس کی اخلاقیت ہے۔ یعنی قدرت نے انسان کو اس کی اخلاقیات کی بنا پر انسان ہونے کا شرف بخشا ہے۔ مادیت سے زیادہ اخلاق کی قدر و قیمت ہے اور کسی بھی معاشرے یا قوم کے عروج و زوال میں اخلاقیات کا بہت حد تک عمل دخل ہے۔ لیکن آج کے دور میں انسان اخلاقیات سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور اخلاقیات کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہے اور اپنی اصل تہذیبی و اخلاقی روایت کو کھو دینے کی وجہ سے تیزی سے پستی کی طرف جا رہا ہے۔ آج کے انسانوں کو اس کی اصل پہچان یعنی اخلاقیات کی قدر و قیمت کو جاننا بے حد ضروری ہے کیونکہ اخلاقیات ہی انسان کے بناؤ اور بگاڑ کا فیصلہ کرنے والی ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمانروا ہیں۔

مسلم معاشرے میں اخلاق کی قدر و قیمت

جس معاشرے کی اساس شائستہ خیالات اور پاکیزہ جذبات پر رکھی گئی ہو وہاں اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے اور اس معاشرے کا ہر فرد ان اخلاقی خوبیوں کو اپنی عزت و آبرو کا سرمایہ سمجھتا ہے اور معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لیے خاندان و قبیلہ کی طرح سے ان اخلاقی اقدار کی حفاظت کرتا ہے۔

اسلام بھی ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جہاں انسانی شرف پروان چڑھے یعنی اسلام انسانیت کو ایک ایسا پاکیزہ ماحول فراہم کرنا چاہتا ہے جس میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہو اور برائیوں کو پھلنے اور پھولنے کے مواقع نہ دیے جائیں۔ یعنی اسلام معاشرے کو ظلم و فساد سے پاک رکھنے کے لیے قانونی نظام سے زیادہ اخلاقی نظام کو اہمیت دیتا ہے۔

انفرادی و معاشرتی دونوں اعتبار سے اسلام نے اخلاق کے قوانین مرتب کیے ہیں۔ بنیادی اخلاقیات کے حوالے سے اسلام میں سب سے اہم بنیادی انسانی اخلاق کی طہارت ہے۔

طہارت بنیادی انسانی اخلاق

قرآن کی اولین ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ ہے:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾[۱۶]

''اور اپنی ذات کو پاک صاف کیجئے۔''

ثیاب ،ثوب کی جمع ہے جس کے معنی لباس کے ہیں۔ مگر یہاں ثیاب سے مراد کپڑے ہی نہیں بلکہ لباس، روح غرض پوری شخصیت مراد ہے۔ قرآن کی اس ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لباس، جسم اور قلب و روح کو ہر طرح کی گندگی سے پاک رکھے۔ قلب و روح کی گندگی سے مراد کفر و شرک کے باطل عقائد و افکار اور اخلاقی مصائب ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾[۱۷]

''اور اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو خوب پاک و صاف رہتے ہیں۔''

۱۶۔ المدثر ۷۴:۴ ۱۷۔ التوبۃ ۹:۱۰۸

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ﴾۱۸

''بے شک اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو زیادہ توبہ کرتے ہیں اور ان کو اللہ محبوب رکھتا ہے جو پاک صاف رہتے ہیں۔''

دنیا کی کسی بھی زبان میں طہارت کا ہم معنی لفظ نہیں ہے۔ یہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہی تھی کہ جنہوں نے انسانوں کو اخلاق کی اصلاح کے لیے نئی اصطلاح وضع کیں اور یہ طہارت کا اخلاقی نظام بھی نئے دور کے بے محابہ نجس مصروفیات کی وجہ سے خطرات سے دوچار ہے۔ لباس جسم وقلب و روح کو ہر طرح کی گندگی سے پاک رکھنا مقصود تھا مگر جسم پر لباس بھی مختصر سے مختصر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جسم ،قلب وروح اور لباس کی پاکیزگی سے زیادہ جسم و لباس کی آرایش و زیبایش پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور قلب و روح بھی طرح طرح کی آلایشوں سے ابھر کر گندگی کا ڈھیر بنتی چلی جا رہی ہے۔

لباس کا اہتمام

مغربی تہذیب آج کے انسان کو عفت و پاک دامنی سے نا آشنا کرنا چاہتی ہے۔ عریانی اس دور کا ایک ایسا فتنہ ہے جس نے انسان کو ہوس کا دیوانہ بنا دیا ہے اور یہ تہذیب فطرت کے اس تقاضے سے بالکل انحراف کر رہی ہے جہاں فطرت کے تحت فحاشی و بدکاری کو ختم کر کے آدمی نے لباس کا اہتمام کیا تھا۔ اسلام بھی آدمی کو تمام جرائم سے پاک رکھنا چاہتا ہے اسی لیے تفصیل کے ساتھ مرد وعورت کے حدود ستر کا تعین کیا ہے اور دونوں کو ان کے التزام کی سخت تاکید کرتا ہے۔

قلب و روح کے اخلاقی اطوار

اسلام قلب و روح کی پاکیزگی پر بھی زور دیتا ہے اور کچھ ایسے اخلاقی و معاشرتی تقاضے کرتا ہے۔ جن سے معاشرہ کو اخلاقیات کے حوالے سے ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی کامیابی ان کے نظریات و عقائد میں چھپی ہوتی ہے۔ اسلام بھی ایسے ہی نظریات عطا کرتا ہے۔ جن پر عمل پیرا ہو کر معاشرہ و افراد کامیابی کی بلند ترین سطح تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسلام کی نظریاتی و اخلاقی اساس یہ ہے کہ اسلام ہمیں تمام تر گناہوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے:

﴿وَ ذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴾۱۹

''اور چھوڑ دو خفیہ و علانیہ ہر قسم کے گناہ کو بلاشبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ،انہیں ان کی بدعملی کی سزا مل کر رہے گی۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَ مَا بَطَنَ ﴾۲۰

۱۸۔ البقرۃ ۲:۲۲۲ ۱۹۔ الانعام ۶:۱۲۰ ۲۰۔ الاعراف ۷:۳۳

''کہہ دو (اے نبیؐ) کہ میرے رب نے تو کھلے اور چھپے تمام فحش کاموں کو حرام کیا ہے۔''

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں۔

((اَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا اَخَذَ عَلَى النِّسَاءِ اَنْ لَّا نُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئاً وَّلَانَسْرِقَ وَلَا نَزْنِيَ وَلَا نَقْتُلَ اَوْلَادَنَا وَلَايَعْضُنَا بَعْضاًo))۲۱

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عورتوں سے عہد لیا تھا اسی طرح سے ہم سے بھی عہد لیا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، زنا نہ کریں، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں، چوری نہ کریں اور یہ کہ ایک دوسرے پر تہمت نہ تراشیں۔''

مغربی معاشروں کا اخلاقی وتہذیبی زوال

مغربی تہذیب کی تمام تر توجہ آزاد جنسی تعلقات، قحبہ گری، عصمت فروشی اور جنسی خواہشات پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہے۔ مغربی تہذیب کا ہر شعبہ تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔

ایک مغربی مفکر پی اے سارو کن کے مطابق'' مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہوگیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گزر رہے ہیں، جسم کا کوئی حصہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کررہا ہو۔ ہمارے بدن میں ناسور ہیں، ہم اس وقت ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسی تمدن (Sensative Culture) ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوری تمدن (Idealogical Culture) ہے۔''۲۲

مغربی تہذیب اخلاق و اعمال، حرص وطمع، سنگ دلی و بیداری، خودغرضی اور دوسروں کے استحصال سے درندوں کی سطح سے بھی نیچے گر گئی ہے۔ انسانی اخلاق سے نا آشنا یہ تہذیب انسان کی روحانی، اخلاقی اور مافوق الطبعی تقاضوں کی تکمیل سے قاصر ہے۔ مغرب قلب و دماغ کے سکون سے محروم ہوگیا ہے اور دوسرے معاشرے بھی مغرب کی اس تباہی کی لپیٹ میں آتے جارہے ہیں اور ہمارا معاشرہ بھی اس اخلاقی زوال کا شکار نظر آتا ہے۔

مغرب میں خاندانی نظام کی حالت زار

مغرب میں خاندان کے حوالے سے جو بحث چل رہی ہے اور اس کی اپنی معاشرت جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس صدی کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے نصف صدی قبل ہی اس امنڈتے ہوئے طوفان کے خطرات کو محسوس کیا اور ہمیں مغربی طرز معاشرت کی آگاہی دیتے ہوئے بیان کیا کہ اس کی بنیاد ۳ عناونین پر رکھی گئی ہے اور وہ ۳ ستون درج ذیل ہیں:

1) عورتوں اور مردوں کی مساوات

۲۱۔ الصحيح لمسلم، كتاب الحدود كفارات لأهله، (ح ۱۷۰۹

۲۲ Will Durant: Pleasures of Life (Translate Mohammad Ajmal Function House P-110-113

2) عورتوں کا معاشی استقلال (Economic Independence)

3) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط ۲۳

ان کی چشم بینا نے مستقبل کا منظر نامہ بیان کرتے ہوئے جن خطرات کی نشاندہی کی تھی آج ہم ان کو عملی طور پر بھگت رہے ہیں۔ مساوات کے خوشنما نعرے نے نہ صرف بطور انسان بلکہ ذمہ داریوں اور کارکردگی میں بھی عورت اور مرد کو برابر لا کھڑا کر دیا ہے اور مساوات کی اس دوڑ نے عورت کو تھکا دیا ہے۔ وہ اپنی فطری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ان بوجھوں کو بھی لاد کر چل نکلی ہے جو فطرت نے اس پر نہیں ڈالے تھے۔ اور دوہری ذمہ داریوں کے بوجھ سے تنگ آ کر اپنی فطری ذمہ داریوں سے تو غافل ہوگئی ہے جس پر نوع انسانی کی بقاء کا انحصار ہے اور معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے اسے اپنی ازدواجی اور عائلی ذمہ داریوں سے دور کر دیا ہے۔ اب وہ انتخابات کی گہما گہمی، صنعتی و تجارتی پیشوں میں مردوں سے مسابقت، کھیلوں کی سرگرمیوں، معاشرے کی تفریحی سرگرمیوں میں کچھ اس طرح سے مشغول ہوگئی ہے کہ اپنے اصلی اور فطری مشاغل سے متنفر ہوگئی ہے۔

''مغرب میں خاندان کا نظام جو تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ بری طرح منتشر ہو رہا ہے۔ اخلاقی مساوات کے غلط تخیل نے عورتوں اور مردوں کے درمیان بداخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔'' ۲۴

مساوات کے اس نعرے نے خاندان کے ادارے کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف سے مرد وزن کو متصف کر کے اپنی اس زمین پر بھیجا تھا تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے سرانجام دے سکیں۔ مغربی تہذیب نے ان ذمہ داریوں کو پھینک کر انہیں ایسے انسانوں میں تبدیل کر دیا ہے کہ مرد مرد نہ رہا اور عورت عورت نہ رہی اور سماج کے تار و پود بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔

معاش کی دوڑ میں عورت اس قدر آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ اس احساس تفاخر میں مبتلا کر دی گئی ہے کہ وہ خود کما کر کھا سکتی ہے تو اسے خاندان کا جھنجھٹ پالنے کی کیا ضرورت ہے؟ عورت کا گھریلو انتظامات کی سربراہ بن کر گھر کی ملکہ بننے کا اعزاز House Wife ہونے کے ناکارہ احساس سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وہ عورت جو نسل انسانی کی تربیت اور تخلیق کے کار عظیم کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے اس سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیا کرتی ہیں؟ تو جواب ملتا ہے کہ 'میں کچھ نہیں کرتی' میں گھریلو عورت ہوں۔''

''مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں اور مردوں کی ذمہ داریوں کی بخوبی ادائیگی میں غیر معمولی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ صنفی میلان جو پہلے ہی مرد اور عورت کے درمیان طاقتور طریقے سے موجود ہے جب اس پر مذہب اور اخلاق کی بندشیں بھی ڈھیلی پڑ جائیں تو اس معاشرے میں پھر زیادہ وسائل اور وقت اسی بات پر خرچ ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے لیے زیادہ جاذب نظر بنا جائے۔ اسی وجہ سے بیوٹی پارلر اور فیشن کی دوڑ کا ایک پورا کلچر بن گیا ہے۔ اربوں ڈالر کی آرائش کی مصنوعات کی انڈسٹری فروغ پانے لگی، اور آخر کار حیوانیت پر مبنی ایک معاشرہ وجود میں آ چکا ہے جس میں اب

۲۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ، ص ۲۴ ۲۴۔ ایضاً، ص ۲۵

کوئی برائی برائی ہی نہ رہی۔فحش لٹریچر، پورنوگرافی پر مبنی ویڈیوز کو آرٹ کا نام دے دیا گیا ہے۔

''یہ گھن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوت حیات کو کھا رہی ہے۔ یہ گھن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی''۔۲۵

یہ ہے وہ اصل صورت حالات اور حقیقی تصویر جو مغربی معاشرہ آج ساری دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔عورت کی بے محابا آزادی نے آج پورے مغرب اور یورپ میں ایک قیامت برپا کردی ہے۔ فحاشی ،عریانی ، آزاد شہوت رانی ، فیشن پرستی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی اقدار کو اپنے پاؤں تلے روندنے کی روش نے انہیں روبہ زوال کردیا ہے۔اس پورے عمل کا آغاز عورت کا اپنے گھر سے باہر قدم رکھنا ، اور پھر خاندانی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد کردینے سے ہوا۔عصری تہذیبی کشمکش میں مغرب کا بنیادی ہدف اس وقت اسلامی تہذیب وتمدن میں عورت اور خاندان کے ادارے کے مقام ومرتبے کو کم کرنا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بھی قوم کا خاندانی نظام اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔اس قوم کا مستقبل اس کے نوجوان ،اس کی عورتیں اور بچے ہوتے ہیں اور انہی کے دم سے خاندانی نظام قائم ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ہم قرآن کی آیات کا تجزیہ کرتے ہیں جن کا تعلق اسلام کے معاشرتی ، معاشی اور سیاسی نظاموں سے ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں سب سے زیادہ آیات معاشرتی نظام سے متعلق ہیں، پھر معاشی نظام سے متعلق اور اس کے بعد سیاسی نظام سے متعلق، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خاندانی نظام صحیح بنیادوں پر استوار ہوگا تو اس کے اوپر کامیاب معاشی اور سیاسی نظاموں کی عمارت قائم کی جاسکے گی۔لیکن اس کے برعکس اگر معاشرتی نظام کھوکھلا ہوگا تو سوسائٹی کے باقی سارے نظام ریت پر محل بنانے کے مترادف ہوگا۔

اگر ہم مغرب کے فیملی سسٹم کا تجزیہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کا خاندانی نظام صنعتی انقلاب کے بعد مسلسل روبہ زوال ہے۔مغرب کے صنعتی انقلاب سے پہلے مرد گھر کا سربراہ ہوتا تھا اور گھر سے باہر جا کر اپنے بیوی بچوں کے لیے روزی کماتا تھا۔عورتیں گھروں میں رہ کر بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیتی تھیں۔ جب مغرب کے خاندانی نظام میں زوال آیا تو پھر اس کو نت نئے چیلنج بھی درپیش ہوئے۔کسی بھی سوسائٹی کی طرح مغربی سوسائٹی میں بھی تنزل وانحطاط کے بہت سے پہلو ہیں۔مثلاً شادیوں کی تعداد میں کمی ، طلاق کی شرح میں اضافہ ،نوکری کرنے والی خواتین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ، ناجائز بچوں کی کثرت ،طلاق یافتہ والدین (ingle Parents) کی بڑھتی ہوئی تعداد۔

خاندان کی اہمیت کو گھٹانے کا رجحان

اگر ہم مغربی معاشرت کا مطالعہ کریں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں پر معاشرتی نظام کو یک جنسی (Unisex) بنایا جارہا ہے جس میں مردوں اور عورتوں کے معاشرتی کردار (Social Role) میں کوئی فرق نہ ہو۔امریکی مفکر جارج گلڈر (George Glider) اپنی کتاب Men & Marriage میں رقم طراز ہے:

۲۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ ،ص ۲۷

''تحریک نسواں کے زیر اثر مغربی معاشرے میں ہر جگہ یعنی سکولوں کالجوں میں، کھیلوں کے میدانوں میں، معاشیات میں، جنسی تعلیم میں اور معاشرتی زندگی میں، عورتوں اور مردوں کو ایک جیسے کردار دیے جاتے ہیں، اس امید پر کہ یک جنسی معاشرہ (Unisex Society) وجود میں آ جائے۔ لیکن نتیجہ اکثر ان کی مرضی کے خلاف نکلتا ہے اور کنفیوژن (Confusion) بڑھتی ہے۔''۲۶

ظاہر ہے کہ ایک خاندانی نظام کی بنیادی اکائی مرد اور عورت ہوتے ہیں اور جب ان دونوں کے کرداروں کو خلط ملط کر دیا جائے تو خاندان کہاں سے وجود میں آئے گا۔

مشہور سوشلسٹ مفکر فریڈرک اینجلز (Fruedrich Engles) نے معاشرے کی ترقی کے لیے خاندانی نظام کے خاتمے پر زور دیا ہے۔ اپنی کتاب The Origin of the Family میں اینجلز لکھتا ہے کہ مادی لحاظ سے تاریخ میں فیصلہ کن کردار ذرائع پیداوار ادا کرتے ہیں جن میں آلات کی پیداوار اور انسانوں کی پیداوار شامل ہوتے ہیں۔ مزید برآں وہ لکھتا ہے:

''یہ واضح ہو جائے گا کہ عورتوں کی آزادی کے لیے پہلی شرط خواتین کو دوبارہ پبلک میں لانا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ہمیں فیملی سسٹم کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ جب ذرائع پیداوار سب کی ملکیت ہوں گے تو اس کا مطلب ہے کہ فیملی معاشرے کی معاشی وحدت میں رہے گی۔ پھر بچوں کی دیکھ بھال پبلک کا معاملہ بن جائے گا اور سوسائٹی ہر طرح کے بچوں کی دیکھ بھال کرے گی چاہے وہ بچے جائز ہوں یا ناجائز۔''۲۷

مغربی معاشرے میں عیاشی کی بڑھتی ہوئی خواہش کے تحت شادی اور فیملی کی اہمیت کو گھٹایا جا رہا ہے اور ضبط ولادت پر زور دیا جاتا ہے تاکہ زندگی سے بھرپور 'لطف' اٹھایا جا سکے۔ شادیوں کی شرح کے معاملے میں سویڈن اور سوئٹزر لینڈ پوری دنیا میں سب سے نیچے ہیں یعنی ہر 1000 لوگوں میں صرف 5 شادی کرتے ہیں۔ روس، جرمنی، فرانس، برطانیہ اور اب امریکہ بھی بہت تیزی سے اسی سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ مشہور امریکی عمرانی سائنسدان کارل ولسن (Corl Wilson) نے اسی بات کا ماتم اپنی کتاب Our Dance has Turned to Death میں کیا ہے کہ ''جب کسی سوسائٹی میں شادی اور فیملی کی اہمیت کو کم کر دیا جاتا ہے تو اس کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔''۲۸

کارل ولسن کے مطابق جو تہذیبیں موت کا شکار ہوتی ہیں ان کی بربادی میں شادی سے فرار کے علاوہ اس زمانے کی تحریک نسواں کا بھی دخل ہوتا ہے جو فیملی کے ادارے کی جڑوں پر تیشہ چلاتی ہے۔ اسی طرح برطانوی علم الانسانیات (anthropology) کے ماہر جے ڈی انون (J.D.Unwin) نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب Sex and Culture میں انسانی تاریخ کی 86 (چھیاسی) تہذیبوں کا مطالعہ پیش کیا جو زوال کا شکار ہوئیں۔ انون کے مطابق ''ان تمام تہذیبوں کے انحطاط کی وجہ جنسی بے راہ روی اور خاندانی نظام کی کمزوری تھی۔ مگر جن قوموں کا خاندانی نظام مضبوط ہوتا ہے اور وہ شادی کی

۲۶۔ جارج گلڈر، Men and marriage، مطبوعہ امریکہ ۲۰۰۱ (پبلکن پبلشنگ ہاؤس)، ص ۱۸

۲۷۔ Fruedrich Engles, The orign of the family, private property and the state, P: 19

۲۸۔ کارل ولسن "Our dance has turned to death", P: 18 مطبوعہ جون ٹینڈیل ہاؤس پبلشرز، امریکہ، 1981ء

قدر کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ترقی کرتی ہیں۔۲۹

مغربی عمرانی سائنسدان پیٹیریم سوروکن (Pitirim Sorokin) نے اپنی کتاب The American Sex Revolution میں امریکہ میں جنسی بے راہ روی کے معاشرتی زوال اور فیملی سسٹم کی تباہی سے تعلق کا مطالعہ کیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ فحاشی اور عریانی کو فروغ دے کر اور خاندان کی اہمیت کو کم کر کے امریکہ اپنی مرضی سے خودکشی (Voluntary Suicide) کا ارتکاب کر رہا ہے۔

سوروکن کے مطابق جب یہاں شادی اور فیملی کی اہمیت کو کم کیا جائے گا تو ہمارے معاشرے میں شرح پیدائش کم ہوجائے گی اور طلاقوں کی شرح بڑھ جائے گی۔۳۰

مغربی فیملی سسٹم میں آج وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہاں کا خاندانی نظام نہایت کسمپرسی کا شکار ہے۔ ماہر عمرانیات کارل ولسن نے زوال یافتہ تہذیبوں کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ ان معاشروں میں چند مشترک خصوصیات پائی جاتی تھیں مثلاً مرد گھروں کا سربراہ بننا پسند نہیں کرتے ، مرد اپنی فیملی کو نظر انداز کر کے مادی وسائل کے حصول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، عورتیں گھر میں ماں کے اہم کردار کو کم تر سمجھتی ہیں، عورتیں اور مرد خدا کی ذات پر یقین نہیں رکھتے اور اپنی زندگیوں پر ایک اعلیٰ ہستی کی حکمرانی کا انکار کرتے ہیں۔۳۱

غور کیا جائے تو مغربی خاندانی نظام میں یہ تمام صفات اب پائی جاتی ہیں اور برگ و بار لا رہی ہیں۔

تنقیدی نظریات

کچھ ماہرین عمرانیات ایسے ہیں جو مندرجہ بالا نظریات پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خاندان معاشرے کی فعالیت میں خرابی پیدا کرنے والے عضو کی طرح ہیں۔ جدید نظریات کے حاملین یا حقوق نسواں کی تحریک کے اصحاب فکر نے خاندان کے روایتی تصور کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ مغربی دنیا کے ایک معروف بشریات (Edmud Leach) نے اپنے مطالعے The Runaway World میں بڑی شدت سے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک خاندان اپنے افراد پر بہت زیادہ دباؤ ڈالتا ہے جس کا نتیجہ تشویش اور ذہنی دباؤ کی صورت میں نکلتا ہے۔۳۲

RD Laing اپنی کتاب The Politics of the Family میں خاندان پر الزام لگانے میں ایک قدم مزید آگے چلا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خاندان کے استحصالی تعلقات اور دباؤ کے ماحول کی وجہ سے دماغی خلل کی بیماری پھیلی ہے۔ اس کی وجہ سے افراد خانہ اپنی شخصیت کھو بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ وہ دوسروں کے احساسات اور سوچوں کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتے ہیں اور یہ چیز نفسیاتی طور پر انسانیت کو نقصان پہنچاتی رہی ہے۔۳۳

۲۹۔ جے ڈی انون "Sex and culture", P: 7 مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، امریکہ ۱۹۳۴ء

۳۰۔ پیٹیریم سوروکن (Pitirim Sorokin)، "The American Sex Revolution", P: 101

۳۱۔ کارل ولسن "Our dance has turned to death", P: 19، ۱۹۸۱ء

۳۲۔ Edmud Leach، *The Runaway World*، بحوالہ: عورت ، خاندان اور ہمارا معاشرہ ، خالد رحمٰن، سلیم منصور خالد، ص۵۳۔۵۴ ۳۳۔ ایضاً، ص۵۳۔۵۴

مغربی خاندانی نظام پر طلاق کی بڑھتی شرح کے اثرات

کسی بھی معاشرے کے فیملی سسٹم کو تباہ کرنے میں طلاق سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ طلاق کی وجہ سے نہ صرف مرد اور عورت کی زندگی برباد ہوتی ہے بلکہ بچوں کی شخصیت بھی پاش پاش ہوجاتی ہے۔ مغرب میں تحریک نسواں کی علمبردار سکالر خاتون جرمین گریئر (Germaine Greer) نے اپنی کتاب "The Whole Women " میں انتہائی غم و غصے کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''تحریک آزادی نسواں اور جنسی انقلاب کا سب سے زیادہ نقصان عورتوں کو ہوا ہے جس کی وجہ سے طلاقوں کی شرح میں بہت اضافہ ہوا ہے اور طلاق یافتہ ماؤں (Divorced Single Mothers) کی تعداد میں کثرت ہوئی ہے اور عام طور پر بچوں کا بوجھ بالآخر انھی کو اٹھانا پڑتا ہے۔[۳۴]

جرمین گریئر کے مطابق'' 1971ء میں برطانیہ میں ہر بارہ گھرانوں میں سے ایک گھر ایسا ہوتا تھا جس کی سربراہ طلاق یافتہ ماں ہوتی تھی، 1986ء میں ہر سات گھرانوں میں سے ایک اور 1992ء میں ہر پانچ میں سے ایک، 2020ء تک تمام برطانیہ میں ایک تہائی (33%) گھرانوں کی قیادت طلاق یافتہ (Single Parents) کریں گے۔ جن میں سے اکثریت خواتین کی ہوگی۔[۳۵]

دیگر مغربی ممالک میں بھی حالات کچھ مختلف نہیں۔ 1960ء میں امریکہ میں ہر سو شادیوں میں سے 26 طلاق پر منتج ہوتی تھیں۔ 1975ء میں طلاقوں کی تعداد 48 تک پہنچ گئی۔ سوویت یونین میں نئی شادیوں کے مقابلے میں طلاقوں کی شرح 1960ء میں 10 فیصد تھی جبکہ 1973ء میں یہ شرح 27 فیصد تک پہنچ گئی۔ فرانس کے سکول کی لڑکیوں کے لیے مرتب کیے گئے ایک سوال نامے (Questionairre) کے جواب میں ان لڑکیوں نے آزادی اور تن آسان زندگی کو اپنی ترجیح قرار دیا اور فیملی کو سب سے کم نمبر دیے۔

امریکہ کا ایک معاشرتی مصلح رابرٹ بلائی (Robert Bly) اپنی کتاب The Sibling Society (مطبوعہ امریکہ 1997) میں لکھتا ہے کہ ''مغربی معاشرے میں جب مردوں اور عورتوں دونوں نے اپنے کیریئر اور اپنی ذات (Individualism) کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ طلاق یافتہ والدین کی صورت میں نکلا اس صورت میں بچوں کو ان کی روحانی تربیت کے لیے معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر ان کے ذہن بچگانہ رہ جاتے ہیں۔[۳۶]

بچوں پر والدین کی طلاق کے زہر آلود اثرات کے متعلق امریکہ کی ٹفٹس یونیورسٹی (Tufts University) میں بچوں کی نشوونما کا پروفیسر اپنی کتاب The Hurried Child میں لکھتا ہے کہ مغربی معاشروں میں جب طلاق یافتہ والدین اپنی دوسری شادی کے لیے جنس مخالف سے ملاقاتیں (Dating) کرتے ہیں تو یہ چیز بچوں کی اخلاقی حس کو تباہ و برباد کر کے دکھ دیتی ہے۔[۳۷]

۳۴۔ جرمین گریئر "The whole women", P: 38" مطبوعہ اینکر پبلشرز، لندن، ۱۹۹۹ء ۳۵۔ ایضاً، ص38

۳۶۔ رابرٹ بلائی "The Sibling Society"(Robert Bly), P: 45 (مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۷ء)

۳۷۔ بی جیزؤ (Proceeding the Sixteenth International Congress of psycology) Bonn1960,

اس کے اثرات یہاں تک ہوتے ہیں کہ یونیورسٹی آف ورجینا کے پروفیسر ماوس ہیدرنگٹن (Movis Hetherington) نے اپنی سماجی تحقیقات میں یہ دریافت کیا کہ'' مکمل گھرانوں کی لڑکیوں یا بیوہ ماؤں کی لڑکیوں کے مقابلے میں طلاق یافتہ ماؤں کی لڑکیاں جنسی لحاظ سے زیادہ متحرک اور مردوں کے آگے بناؤ سنگھار کرنے والی (Flirtations) ہوتی ہیں۔۳۸

مغربی خاندانی نظام پر ماں کی ملازمت کے اثرات

کسی بھی صحت مند معاشرے کی بنیاد اس کا مضبوط خاندانی نظام ہوتا ہے۔ اس خاندانی نظام کو ماں اور اس کی محبت نے سنبھالا دیا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق '' بچے کی 75 فیصد شخصیت اس کی زندگی کے ابتدائی چند سالوں میں بنتی ہے۔''۳۹

اب جبکہ ماں ہی کیریئر کی خواہش میں گھر سے نکل کھڑی ہوگی تو بچے کی شخصیت کا انحصار ٹی وی، میوزک اور ڈے کیئر سینٹروں پر رہ جائے گا۔ صنعتی انقلاب کے بعد مغربی معاشرے میں خواتین بہت تیزی کے ساتھ نوکری کے میدان میں آئیں جس کی وجہ سے ان کا خاندانی نظام بری طرح متاثر ہوا۔

اقوام متحدہ کی معاشرتی اور معاشی کونسل Economic and Social Council of theUN (ECOSOC) کے اعداد وشمار کے مطابق پچھلے 25 برسوں میں خواتین کا معاشی میدان میں حصہ بہت تیزی سے بڑھا ہے۔ وہ مغربی ممالک جن میں نوکری کرنے والی خواتین کی شرح 80 فیصد سے زیادہ ہے ان میں سوویت یونین، جرمنی، ہنگری، بلغاریہ، پولینڈ وغیرہ شامل ہیں جبکہ امریکہ، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ وغیرہ بہت تیزی سے اس شرح کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ خواتین کے بچوں کی پرورش چھوڑ کر نوکریوں کے لیے نکل جانے کے اثرات آج وہاں ظاہر ہو رہے ہیں۔

سویڈن کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ وہاں پر بچوں کی شرح اموات سب سے کم ہے جبکہ شہریوں کی اوسط زندگی پوری دنیا میں سب سے زیادہ۔ جہاں تعلیم ہر درجے میں مفت اور لوگوں کی تنخواہیں بہت زیادہ۔ سویڈن میں دنیا کی ہر طرح کی نعمت ہونے کے باوجود ذہنی مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے سویڈش پارلیمنٹ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کی وجوہات پر غور کرے۔ اس کام کے لیے اس نے معروف ماہرنفسیات ڈاکٹر ہینز لومین (Hans Loman) کو منتخب کیا۔ ڈاکٹر لومین نے اپنی تحقیق کے نتائج میں بتایا کہ: ''سویڈن میں چونکہ خواتین کی اکثریت نوکری کرتی ہے اس لیے یہاں پر خاندانی نظام بری طرح متاثر ہوا ہے۔ سویڈن میں ایسی عورتیں جن کے بچے تین سال یا کم عمر کے ہیں ان میں سے 50 فیصد سے زیادہ نوکری کرتی ہیں اور جن کے بچے 17 سال کی عمر یا اس سے کم کے ہیں ان میں سے 70 فیصد سے زیادہ خواتین نوکریاں کرتی ہیں۔ ڈاکٹر لومین کے مطابق ''اس وجہ سے ہم نے اپنے بچوں کے لیے انتہائی بے حس اور بچوں کے خلاف (antichildern) ماحول پیدا کر دیا ہے۔۴۰

۳۸۔ ڈیوڈ ایل کنڈ (David Elkind) ای ایم ہیدرنگٹن آرکان، ایم کاس، (The After math of divorce, P: 5)

۳۹۔ ڈاکٹر گوہر مشتاق ''ایک آنکھ والا دجال'' مطبوعہ لاہور، 2006ء، ادارہ بتول، ص ۵۷

۴۰۔ جے ایچ سٹیومنز اور میتھیوز "Mother Child, Father Child Relations", P: 13 مطبوعہ واشنگٹن، ڈی سی۔

یہ تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ گھر میں ماں کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس ملک میں تمام تر آسائشوں کے باوجود بچے بڑے ہوکر ذہنی مریض بن رہے ہیں۔فطرت سے جنگ کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ماں کے مقام کو گرانے کی روش

مغرب میں کارفرما تحریک آزادی نسواں عورت کو گھر کی فکر سے بالکل 'آزاد' کردینا چاہتی ہے کیونکہ ایک فیملی کو ماں کی محبت ہی جوڑے رکھتی ہے اور ماں کی محبت اور اعلیٰ تربیت سے اچھے انسان تیار ہوتے ہیں جو مغرب کے سیکولر نظام کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیویارک میگزین کے ستمبر 1975ء کے انٹرویو میں تحریک نسواں کے حمایتی فرانسیسی مفکر سائمون ڈے بیووائر (Simon Beauvior) نے برملا کہا تھا ''جب تک خاندان، ماں پنا (Motherhood) اور ماں کی جبلی محبت (Maternal Instinct) کے تصور کو تباہ نہیں کریں گے، عورت آزاد نہیں ہوسکتی۔''[۴۱]

مغرب کے مخلص سماجی مصلحین معاشرے کے ماں کے مقام کو کمتر سمجھنے کے رویے سے نالاں ہیں۔ امریکی مفکر جوزف چلٹن پیئرس (Jeseph Chilton Pearce) اپنی کتاب Evolution's End میں لکھتے ہیں کہ :''ہمارے معاشرے میں جنس (Sex) ایک قیمتی معاشی شے (Economic Commdity) سمجھی جاتی ہے اور معاشرے کے سر پر جنون کی طرح سوار ہے اور خاتون کا حاملہ ہونا ایک غلطی سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی ماؤں کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ زچگی ایک خطرناک عمل ہے کیونکہ معاشرہ کنواری لڑکیوں کی قدر کرتا ہے۔[۴۲]

یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشرے میں سیلز گرل ، ماڈل گرل ، سیکرٹری ، رقاصہ ،گلوکارہ ، فلمی ہیروئن اور نوکری کرنے والی عورت کی ماں سے زیادہ عزت ہوتی ہے کیونکہ یہ عورتیں گھر اور پردے سے باہر نکل کر پیسہ کماتی ہیں جبکہ ماں گھر میں رہ کر بچوں کی تعلیم و تربیت کرتی ہے اور خاندان کو جوڑ کر رکھتی ہے ۔مغربی تہذیب میں ماں کے مقام کو غلامی قرار دیا جاتا ہے اور اس سے آزادی دلانے کا یقین دلایا جاتا ہے۔

بچوں کے ڈے کیئر اور بوڑھوں کے اولڈ ہومز

مغرب میں تحریک نسواں والے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے کتنی ہی عورتوں کو خاندان اور بچوں کی ''غلامی'' سے آزاد کروا کر باہر نوکری دلوائی ۔لیکن مغرب میں ماؤں کا اپنے بچوں کو دودھ نہ پلانا ، چھوٹے بچوں کو اپنے سے دور دوسرے کمرے میں سلانا ،ان کو 3 یا 4 سال کی عمر میں سکول داخل کروادینا اور خود نوکری کرنے کی خاطر بچوں کو ڈے کیئر سینٹرز (Day Care Centres) میں داخل کروانا، یہ سب چیزیں برگ و بار لا رہی ہیں اور وہاں کے بچے اپنے والدین کو ان کے بڑھاپے میں اولڈ ہومز (Old Homes) میں چھوڑتے ہوئے کسی قسم کی کوئی خلش یا احساس گناہ محسوس نہیں کرتے۔ ایسے بچے اپنی ماؤں کو جنھوں نے اپنے کیریئر کے جنون میں اپنے بچوں کو پیار سے محروم کیا ہوتا ہے ،ان کی غیر موجودگی میں

۴۱۔ سائمون ڈے بیووائر "New York magazine Saturday Review" Sept-1975

۴۲۔ جوزف چلٹن پیئرس (ہاربرستان فرانسکو) "Evolution's End", P: 56 مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۲ء

اپنے دوستوں کی محفلوں میں انھیں احمق قرار دینے میں کوئی تأمل نہیں کرتے۔

عظیم بوسنین مفکر علی جاہ عزت بیگووچ اپنی شہرہ آفاق کتاب Islam Between East and West میں لکھتے ہیں کہ سوسائٹی میں بچوں کے Day Care Centers اور بوڑھوں کے Old Homes دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہ ہمیں مصنوعی ولادت اور مصنوعی وفات کی یاد دلاتے ہیں۔ دونوں ادارے کسی سوسائٹی سے رحم و محبت کے فقدان اور فیملی سسٹم کے ٹوٹنے کی علامت ہوتے ہیں۔ دونوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں والدین کا تعلق (Parental Relationship) غائب ہوتا ہے۔ Day Care Centres میں بچے والدین کے بغیر ہوتے ہیں اور Old Homes میں والدین کو بچے میسر نہیں ہوتے۔[۴۳]

عالمی شہرت یافتہ ماہر علم الانسانیات خاتون مارگریٹ میڈ (Margaret Mead) نے پوری دنیا کے مختلف قبائل کا دقیق مطالعہ کیا تھا۔ اس نے یہ مشاہدہ بیان کیا کہ سب سے زیادہ جھگڑالو وہ قبائل ہوتے ہیں جن میں بچوں کے ساتھ ان کے بچپن میں تشدد کا رویہ رکھا جاتا ہے۔ کینیڈا کی ماہر نفسیات خاتون اور Natural Child Project پروگرام کی ڈائریکٹر جین ہنٹ (Jane Hunt) اس تحقیق پر اپنی کتاب The Natural Child میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ جب بچپن کے دور میں بچوں کی خواہشات کا احترام نہیں کیا جائے گا بالخصوص ان کا اپنی ماؤں سے جسمانی تعلق (Body Contact) تو پھر وہ بچے بھی بڑے ہو کر اسی طرح اپنے والدین بلکہ پوری سوسائٹی کے ساتھ سرد مہری کا مظاہرہ کریں گے۔[۴۴]

ایسی صورت میں خاندانی نظام میں وحدت و یگانگت مفقود ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ خاندان بذات خود ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی بحث سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب میں خاندانی نظام کس قسم کے چیلنجز سے دوچار ہے۔ مغرب نے ہالی وڈ کی فلموں کے ذریعے پوری دنیا میں اپنے معاشرے کی جو چمک دمک پیش کی ہے وہ حقیقت میں سراب سے زیادہ نہیں۔

آج مسلمان ممالک کے روشن خیال دانشور مغرب سے آنے والی ہر چیز کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے ہیں۔ شاید انھوں نے مغرب کے سماجی مصلحین کی کتابیں پڑھنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی۔ آج جب مسلمان مائیں کیریئر کی ہوس اور مغرب کی نقالی میں اپنے بچوں کو ڈے کیئر سینٹرز میں چھوڑتی ہیں تو وہ یہ بات بھول جاتی ہیں کہ یہ بچے بھی مستقبل میں انھی ماؤں کو بے دردی کے ساتھ اولڈ ڈے کیئرز میں چھوڑ دیں گے۔ ایسے مسلمان یہ بھول جاتے ہیں کہ جب کوّا ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ آج مسلمان معاشروں میں جہاں بھی مغرب کی نقالی کی جا رہی ہے وہاں وہی چیلنج سامنے آ رہے ہیں جن سے مغربی معاشروں کو واسطہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً طلاقوں کی کثرت، ماؤں کی کیریئر کی ہوس اور پھر نوکری پر خواتین کا جنسی استحصال، نوجوانوں کا والدین سے بغاوت کرنا وغیرہ۔

مسلمانوں کے علاوہ مشرق کے جن دوسرے معاشروں نے بھی مغرب کی نقالی کی ہے وہ بھی خسارے میں رہے

۴۳۔ علیجاہ عزت بیگووچ "Islam between east and west" (خیالی ریاست اور خاندان) ص ۲۴۸

۴۴۔ جین ہنٹ "The Natural Child", P: 13 مطبوعہ کینیڈا، ۲۰۰۱ء نیو سوسائٹی پبلشرز

ہیں۔ امریکی مفکر جوزف چلٹن پیئرس اپنی کتاب Evolution's End میں لکھتا ہے کہ تقریباً 25 سال پہلے جاپان نے پہلی مرتبہ بچوں کے لیے ڈے کیئر سینٹرز کی بنیاد رکھی۔ اگلے دس سالوں میں دیکھتے ہی دیکھتے سکولوں اور گھروں میں تشدد اور ماردھاڑ کے واقعات عام ہوگئے اور 'ذہنی دباؤ' کے ماحول کی وجہ سے جاپان کے نوکری کرنے والے طبقے میں شراب خوری کی عادت نہایت تیزی کے ساتھ بڑھی۔[۴۵]

جاپان میں جو سب کچھ ہوا یہ دراصل ان کے فیملی سسٹم کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اگر جاپانی عورتیں گھروں میں رہ کر اپنے بچوں کی محبت کے ساتھ تربیت کرتیں تو ڈے کیئر سینٹرز کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ مائیں خاندان کو جوڑے رکھتیں مگر یاَحَسْرَةً عَلَى الْعِبَاد.

اس باب کے اختتام پر امریکہ کے ایک سماجی مصلح بیری سینڈرز (Barry Sanders) کی مغربی معاشرے کو نصیحت دی جاتی ہے جو اس نے اپنی کتاب A is for OX میں دی ہے۔

> ''ہر ماں چاہے وہ غریب ہو یا امیر اسے چاہیے کہ وہ گھر واپس آئے۔ کم از کم بچوں کے بڑے ہونے تک۔ اس کے بعد بھی ماں کی گھر میں موجودگی بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ بچوں کو اپنا دودھ پلائیں۔ فیملی کے ایک دوسرے سے جڑ کر رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ماں بچوں کو کہانیاں سنائے، ان سے مسلسل باتیں کرے اور ان کی باتیں سنے۔ فیملی کا ہر فرد، قبیلے کے کارکنوں کی طرح اپنے ساتھ ماں کی سنائی ہوئی کہانیاں رکھتا ہے۔ فیملی دراصل ایک پورے گھرانے کی زندگی کی کہانی ہوتی ہے۔''[۴۶]

مغربی تہذیب کے مسلمانوں پر اثرات

مغرب آج ایک غیر مذہبی تہذیب بن چکا ہے جس کے اپنے کچھ معاشی و سیاسی مفادات ہیں، اور جن کے حصول کے لیے اس کی پالیسی غیر مغربی اقوام کے لیے یکساں ہے۔[۴۷]

اسی اسلام دشمن پالیسی کی وجہ سے آج نہ صرف مغربی معاشرے میں بلکہ تمام تر اسلامی معاشروں میں بھی فتنہ وفساد برپا ہے اور جو صورت حال نظر آ رہی ہے اس پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے معاشرے کو ایسے خطرات درپیش ہیں جن کا سدباب نہ کیا گیا تو ہمارا معاشرہ جسے چودہ سو سال پہلے ہمارے نبیؐ نے گمراہی اور جہالت کے اندھیروں سے نکالا تھا۔ مبادا انہی اندھیروں کی طرف لوٹ جائے۔

لیکن افسوس اس بات کا بھی ہے کہ جن ذرائع سے ہم اس اسلامی نظام کو واپس لاسکتے ہیں وہی ذرائع دراصل ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ مغربی تہذیب کی نقالی نے ہمارے معاشرے کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت پورے

۴۵۔ جوزف چلٹن پیئرس "Evolution Ends", P: 15

۴۶۔ بیری سینڈرڈ "A is for Ox", P: 176 مطبوعہ نیویارک ۱۹۹۸ء (وینٹیج بکس)

۴۷۔ بیری سینڈرڈ "A is for Ox", P: 9 مطبوعہ نیویارک ۱۹۹۵ء (وینٹیج بکس)

عالم اسلام میں مشرقیت ومغربیت کی کشمکش برپا ہے۔اسی کشمکش کے پیش نظر اگر غور کیا جائے تو مغرب نے عالم اسلام میں اسی تہذیب کوفروغ دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں مغرب کامیاب بھی ہوا ہے اور مغرب کی یہ کامیابی بلاشبہ ہماری تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہے۔۴۸

سید معروف شاہ شیرازی نے اپنی کتاب ''اسلام ومغرب کی موجودہ عالمی کشمکش'' میں اس طرح سے بیان کیا ہے:

''اہل مغرب کو چاہیے کہ وہ اپنے ذہن سے تہذیبوں کی جنگ کے تصورات نکال دیں، تہذیبوں کی آپس میں جنگ نہیں ہوتی، جنگ ہمیشہ تہذیب و بدتہذیبی کے درمیان ہوتی ہے۔''۴۹

حق و باطل کی جنگ میں ہمیں حق اور سچائی کے ساتھ اپنی معاشرت کو بچانا ہے اور جو خطرات ہمارے معاشرے کو لاحق ہیں ان خطرات سے اپنے معاشرے کو بچانا ہے اور آج اسلامی معاشرے کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ ''خاندان'' کا ادارہ ہے۔''بزعم خود ترقی یافتہ ممالک میں آج خاندانی نظام مکمل طور پر تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور اس کے نتائج پوری دنیا بھگت رہی ہے۔ دنیا کے عالمی گاؤں (گلوبل ویلیج) بن جانے سے ان کی معاشرتی بے راہ روی دنیا بھر کے معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور یہ تہذیبی بے راہ روی ایک منصوبے کے تحت مسلم ممالک کو بھی برآمد کی جا رہی ہے۔''۵۰

بقول سید قطب شہید:

''اس دنیا میں نہایت ہی منظم کوششیں اس لیے کی جا رہی ہیں کہ اللہ جل شانہ کی مرضی کے خلاف اقدار حیات، اخلاقی پیمانے اور تصورات ایجاد کیے جائیں اور انسانی زندگی میں ایسے اجتماعی روابط اور ایسی عمرانی بنیادیں رکھی جائیں جو ان روابط اور بنیادوں سے مختلف ہوں جنھیں اللہ نے رائج کیا۔ جو حضرات ان مساعی نامشکور میں رات دن مصروف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصد تو صرف مسلم ممالک کے اندر اسلامی معاشرے کی بنیادیں منہدم کرنے تک محدود ہے لیکن وہ فقط اسلامی نظام معاشرت ہی کو تباہ نہیں کر رہے بلکہ وہ پورے عالم انسانیت کی اقدار کو تباہ کر رہے ہیں، وہ اقدار جن پر پوری انسانیت کی اعلیٰ اجتماعی قدریں کھڑی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی اس پالیسی کی وجہ سے پوری انسانیت کو ان عناصر سے محروم کر دیا ہے۔ جن کی وجہ سے انسانیت نے اپنے کندھوں پر امانت کبریٰ کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ ان لوگوں کی اس پالیسی کی وجہ سے انسانیت ایسے تربیت یافتہ بچوں کی دولت سے محروم ہوگئی ہے جنھوں نے ماں کی گود میں تربیت پائی۔ یاد رہے کہ بچے کے لیے ماں کی گود ہی پرامن گہوارہ ہوتی ہے اور اس تربیت میں بچہ بے لگام شہوانی جذبات سے محفوظ ہوتا ہے۔ نیز وہ بدلتے ہوئے میلانات اور خواہشات کا شکار نہیں ہوتا اور نہ وہ ایسی خواہشات کا کھلونا بنتا ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رخ بدلتی رہتی ہیں۔ ماں کی گود میں تربیت پانے والا بچہ ہی بنی نوع انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ

۴۸۔ معارف فیچر سروس ''اسلام اور مغرب کے مفادات متصادم ہیں'' ڈاکٹر محمد شکیل اوج، ص ۶۱

۴۹۔ سید معروف شاہ شیرازی، اسلام اور مغرب کی موجودہ عالمی کشمکش، ص ۱۱۴

۵۰۔ رخسانہ جبیں، ڈاکٹر، عورت خاندان اور ہمارا معاشرہ (خاندان، استحکام کے بنیادی تقاضے، ص ۱۱۔۱۲

برآ ہوسکتا ہے۔''[۵۱]

گویا مستحکم خاندان ایک معاشرے کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کی ضرورت ہے چنانچہ اس پس منظر میں ان عوامل کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے، جن کی وجہ سے خاندان کے ادارے کو مختلف خطرات درپیش ہیں۔ غور کریں تو اس سلسلے میں بنیادی طور پر تین نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں۔

☆ ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ خاندانی استحکام کو سب سے زیادہ خطرہ طرز معاشرت سے ہے۔ میڈیا کی بے راہ روی اس کی بڑی وجہ ہے۔

☆ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ہر مسئلے کی وجہ جواز مغربی تہذیب کے غیر متوازن رویوں میں نہیں تلاش کرنی چاہیے۔ اس کی اصل وجہ ہمارے معاشرتی رسوم و رواج ہیں، مثلاً بے جوڑ شادیاں، سورہ، وٹہ سٹہ، جہیز وغیرہ۔

☆ تیسرے مکتب فکر کا خیال ہے کہ اصل وجہ ملکی و معاشی حالات ہیں۔ غربت، طویل عرصہ بیرون ملک قیام، جیلوں میں طویل نظر بندی وغیرہ۔

میرے نزدیک یہ وجوہ اہمیت تو رکھتی ہیں لیکن غور کیا جائے تو یہ مسئلے کو جڑ سے پکڑنے کی بجائے شاخیں اور پتے تراشنے کے مترادف ہے۔ یعنی ان کی حیثیت بنیادی نہیں ہے۔ اگر غربت اور معاشرتی ناہمواری اصل وجہ ہوتی تو آج ترقی یافتہ ممالک میں خاندان کا شیرازہ یوں نہ بکھرا ہوتا۔ نیز خاندان نبویؐ اور صحابہؓ سے زیادہ معاشی غربت کہاں ہوگی جہاں کئی کئی روز تک چولہا نہیں جلتا تھا لیکن خاندان مثالی حد تک مستحکم تھا۔[۵۲]

اسلام ہمیں خاندان کا ایک وسیع ترین تصور دیتا ہے۔ اسلام خاندان کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو حقوق و فرائض، خلوص و محبت، ایثار و قربانی کے احساسات اور جذبات سے بندھا ہوا ہے۔ اسلام خاندان سے بننے والے معاشرے کے تمام تر معاملات کی اساس اخلاق کو بناتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾[۵۳]

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾[۵۴]

۵۱۔ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن جلد اول، (ترجمہ سید معروف شاہ شیرازی) ادارہ منشورات اسلامی، لاہور

۵۲۔ عورت، خاندان اور ہمارا معاشرہ، خالد رحمٰن، سلیم منصور خالد، ص ۱۱۳

۵۳۔ الحجرات ۴۹:۱۳ ۵۴۔ التحریم ۶۶:۶

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔''

ان آیات قرآنی کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ خاندان کا ادارہ ایک اسلامی معاشرے میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔یعنی یہ مرد وعورت کا تعلق اور واسطہ صرف چند لمحوں یا چند مہینوں کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جو مرد اور عورت دونوں پر لاگو ہے۔ان کا تعلق نہ صرف اپنی ذات سے ہے بلکہ ان پر ان کی آئندہ آنے والی نسلوں کی تربیت کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

ماں، باپ، بیوی، بچے، خالہ، ماموں، بہن اور بھائی ایسے الفاظ جو ہر زبان کی لغت میں موجود ہیں اور ان رشتوں کی محبت کو انسان نے محسوس کیا ہے اور ان رشتوں کے بغیر انسان جسمانی، ذہنی اور روحانی اذیت کا شکار ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا﴾[۵۵]

''اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پیدا کیا اسی میں سے اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو،اس اللہ سے سوال کرتے رہو،تم ایک دوسرے کا واسطہ دے کر اور ڈرتے رہو رشتوں (کی نزاکت) سے بھی بے شک تم پر ہر وقت نگہبان۔''

اس آیت کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام خاندان کے ادارے کو مکمل استحکام اور مضبوطی فراہم کرتا ہے۔ایک سچا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنے معاشرے کو فاسد خیالات اور بڑھتی ہوئی اخلاقی وجنسی بے راہ روی سے بچانا ہے اور خاندان کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے اور افراد معاشرہ میں ایسے خیالات اور تصورات کو پروان چڑھانا ہے جس سے وہ اپنے خاندانوں کو بنانے اور برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کندھوں پر اپنے خاندان کی ذمہ داری کو بوجھ نہ سمجھیں۔

۵۵۔ النساء۴:۱